اکیسویں صدی کے تقاضے

ہارون الرشید ⁰

نواح آگرہ میں کنواہہ کی تاریخی جنگ سے پہلے تھکے ہارے ترک سپاہیوں کے اصرار پر جب محمد شریف منجم نے ظہیرالدین بابر کو جنگ سے بچ نکلنے کا مشورہ دینے کا ارادہ کیا تو اسے یقین تھا کہ اس کی رائے ہرگز مسترد نہ کی جائے گی۔ محض اس لیے نہیں کہ ازبک اور ترک سپاہی اپنے تاتاری پڑوسیوں کی طرح توہم پرست واقع ہوئے تھے اور ستارہ شناسوں کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ رانا سانگا کی دو لاکھ تازہ دم افواج کے مقابل بابر کے ساتھ صرف ۱۲ ہزار تھکے ماندے عساکر موجود تھے۔ وہ شمشیر بردار جنھیں کابل اور فرغانہ کے چمن زاروں اور ندیوں کی یاد نے نڈھال کر رکھا تھا۔

بابر اپنے جواں سال اور لاابالی فرزند ہمایوں کے ہاتھ خزانوں کا بڑا حصہ، بدخشاں بھیج چکا تھا تاکہ وہ ترک اقتدار کا سایہ ماوراء النہر تک دراز کرنے کی کوشش کرے۔ کچھ تیمور کی پیروی میں بانٹ چکا تھا کہ وسطی ایشیا کا ہر حکمران داد و دہش میں کبھی نہ کبھی تیمور بننے کی کوشش کرتا۔ ہیرے اور جواہر میں سے جو کچھ باقی بچ رہا، وہ لاڈلا شہزادہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر ہی اڑا لے گیا۔ وہ باپ کی کمزوریوں سے واقف تھا کہ وہ اولاد سے بے تاب محبت کا شکار رہتا ہے اور روپے پیسے کے معاملے میں کبھی اصرار سے کام نہیں لے سکتا۔

ترک سپاہی اور سردار اس وقت حیران رہ گئے جب انھوں نے دیکھا کہ محمد شریف منجم سے مشورہ تو کیا بادشاہ نے اسے باریابی تک کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ”میں اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا“ چگی داڑھی والے اس عجیب و غریب فاتح نے کہا، جو ۱۲ برس کی عمر میں بادشاہ بن گیا تھا، جو اپنی افواج کو اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا اور پچھلی ربع صدی سے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھا، حتیٰ کہ لوگ تیمور اور چنگیز خاں سے اس کا تقابل کرنے لگے تھے۔

⁰ معروف صحافی، دانش ور

وہ سب کے سب حیران تھے کہ اس نے پسپائی کے بارے میں سوچنے تک سے انکار کر دیا تھا حالانکہ ہر بڑا عسکری دماغ اس امر کو ملحوظ رکھتا تھا۔ سپہ سالار کتنا ہی بے پناہ ہو اور اس کے سپاہی کیسے ہی بے مثال واقع ہوئے ہوں' آخر کار وہ گوشت پوست کے انسان ہی تو تھے۔ کیا یہ وہی سپہ سالار نہ تھا جسے پوستین پہننے والے شیبانی خان نے دو بار موسموں کی شدت والے شہر سمرقند سے مار بھگایا تھا لیکن اب وہ ایک عجیب عالم میں تھا اور مسلسل جنگی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ آخر کیوں؟ انھوں نے سوچا: بالآخر اس پر وہ پاگل پن سوار ہو گیا ہے' جو بے شمار کامیابیوں کے بعد ایک آخری اور تباہ کر دینے والی ناکامی لے کر آتا ہے۔

وہ بے خبر تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ظہیرالدین بابر کا ہمیشہ تجربات میں جتا رہنے والا شہ دماغ ساتھی' علی قلی خان توپ سازی پر اپنے تجربات مکمل کر چکا ہے۔ چوڑے دہانے والی دور مار توپیں جو چشم زدن میں بارود بھری بندوقیں چلانے والے سیکڑوں عسکریوں کے پرخچے اڑا سکتی تھیں۔

دریائے جمنا کے کنارے تیسرے دن کی خوں ریز جنگ' گھوڑا گاڑیوں کے پیچھے آخری وقت کے لیے بچا کر رکھے گئے دو ہزار تازہ لشکریوں نے نہیں' درحقیقت انھی توپوں نے جیتی تھی' ہرچند کہ بابر نے اس قدر فیاضی سے سپاہیوں کو خلعتیں اور انعامات عطا کیے کہ ان میں سے ہر ایک خود کو فاتح سمجھ رہا تھا۔

جنگ کے فوراً بعد' جس نے آنے والی کئی صدیوں کے لیے ہندستان کی تاریخ کا رخ متعین کر دیا' بابر نے علی قلی خان کو طلب کیا اور اسے "نادر العصر" کا خطاب عطا کیا۔ بادشاہ خطابات عطا کرنے کے معاملے میں ہمیشہ ایسے ہی فیاض تھے لیکن تاریخ میں کم ہی خطاب اتنے زیبا ہوں گے۔ کیا یہ خطاب بابر کے اپنے ذہن کی تخلیق تھا یا اس نے مولانا زین العابدین سے مشورہ کیا تھا؟ ترک سردار تھوڑی سی فارسی جانتا تھا اور فارسی کا ایک محاورہ تو وہ اکثر دہرایا کرتا تھا: "ہمہ یاراں دوزخ' ہمہ یاراں بہشت"۔ لیکن اس امر کی ہرگز کوئی شہادت نہیں ملتی کہ وہ عربی زبان کا کچھ زیادہ علم رکھتا ہو--- اور "نادر العصر" کیسی شان دار ترکیب ہے۔ وہ یقیناً ایک ڈھنگ کا نثرنگار تھا اور شاعر بھی' لیکن وہ کوئی رودکی اور سعدی تو ہرگز نہ تھا۔

اگلی صدیوں کے ان گنت مؤرخوں نے کنواہہ کی اس ہمیشہ یاد رکھی جانے والی جنگ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ظہیرالدین بابر کی ترک مے نوشی کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کئی برس پہلے مایوسی اور اضطراب کے ان تین دنوں کے سوا جب وہ مسلسل مدہوش رہا تھا' بابر کبھی بلانوش نہ تھا۔ وہ اس وقت لگ بھگ ۳۰ برس کا ہو چکا تھا جب اس نے پہلی بار شراب چکھی۔ وہ تلوار کا فرزند تھا اور تلواروں کے فرزند اپنی شامیں رنگیں نہیں کیا کرتے۔

جیسا کہ تین سو برس بعد جنم لینے والے مشرق کے عظیم الشان شاعر نے کہا تھا: یہ اسلام ہے جو مصیبت کی گھڑی میں ہمیشہ مسلمانوں کے کام آیا ہے نہ یہ کہ مسلمان' اسلام کے کام آئے------ سارے لشکر سے شراب نوشی کے طلائی برتن سمیٹے اور توڑ ڈالے گئے۔ خود پسند فاتح نماز کے مصلے پر کھڑا ہوا اور زار و

قطار روتا رہا۔ کیا یہ موزوں ہوگا کہ ہم یہاں ایک ساعت کو رک جائیں اور خود سے سوال کریں کہ آخر کار وہ کون سی چیز تھی، جس نے دشمن کی سرزمین کے وسط میں کھڑے ۱۲ ہزار اجنبی عساکر کو لوہے میں ڈوبے دو لاکھ فرزندان سرزمین پر بالادستی عطا کی۔ اللہ کی بارگاہ میں سپہ سالار کی گریہ و زاری، اس کا بے مثال عزم و ارادہ یا "نادر العصر" کی ڈھالی ہوئی وہ توپیں جن کا ہمیشہ باہم متصادم رہنے والے ہندو راجوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ سوال کرے کہ سیکڑوں برس کی دوری پر آج ہم اس سوال کا جواب کیسے دے سکتے ہیں کہ تفصیلات بہم نہیں اور جزئیات معلوم کرنا مشکل ہے۔ نہیں، یہ اعتراض ناقص ہے۔ جب تاریخ میں حالات کی کروٹ بدل دینے اور دل کو چھو لینے والے عظیم واقعات رونما ہوتے ہیں تو وہ کبھی ایسے قدیم اور مبہم نہیں ہوتے۔ اور یہ اعتراض تو سرے سے بے معنی ہوگا کہ ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ ہم یقیناً وہیں تھے۔ گزرتا ہوا وقت اس طرح کے واقعات پہ گرد نہیں ڈال سکتا۔ وہ کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ جو چیزیں ہمارے دل و دماغ میں تازہ رہتی ہیں، وہ کبھی قدیم اور کہنہ نہیں ہوتیں۔

گذشتہ صدیوں کا مؤرخ بابر کی ترک مے نوشی کی کہانی سناتا ہے لیکن وہ سالہا سال پر پھیلی ان کوششوں کا سراغ نہیں لگاتا جو "نادر العصر" کی توپیں تکمیل پانے تک بروے کار آئیں--- آخر کیوں؟ لیکن ذرا ٹھہریئے اور ساتھ ہی اس سوال کا جواب بھی عنایت فرما دیجیے کہ گذشتہ دو صدیوں کے مؤرخ، ٹیپو سلطان کی سیرت میں پلاسی کی جنگوں، سرنگاپٹم کے آخری معرکے اور اپنے بیٹوں کو یرغمال کے طور پر پیش کرنے کے سنسنی خیز واقعات کی تفصیل تو بتاتے ہیں لیکن ایک جدید بحریہ اور ایک بالکل ویسا نہری نظام تشکیل دینے کے لیے اس نادر بادشاہ کی عرق ریزی کیوں بیان نہیں کرتے، جیسا کہ بعدازاں انگریزوں نے بنایا اور اب تک ایک عجوبہ مانا جاتا ہے۔ اگر آپ میری خطا معاف کر دینے پر آمادہ ہوں تو میں اس سوال کا جواب دینے کی جسارت کرتا ہوں۔ نہایت مؤدبانہ التماس یہ ہے کہ بابر کے جانشینوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا جو سائنس اور ٹکنالوجی کی فضیلت اور اہمیت سے رتی برابر بھی آشنا ہو۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ رتی برابر بھی نہیں، ایک ذرہ بھی نہیں۔ اس معاملے میں سب کے سب بہت ہی بے نیاز واقع ہوئے تھے، سوائے اس ایک آدمی کے جس کا نام فتح علی خان تھا جو حیدر علی کا فرزند تھا اور جسے تاریخ نے ٹیپو کے نام سے یاد رکھا۔

یہاں ایک چھوٹا سا سوال اور ہے جو کسی بھی قلب کے کسی گوشے میں ابھر سکتا ہے۔ کیا بابر کی توپیں خوش قسمتی سے برپا ہونے والا ایک حسنِ اتفاق تھیں؟ آخر فرغانہ کے جنگلوں میں ننگے پاؤں گھومنے پھرنے، دیر تک دوستوں سے اشعار اور حکایات سننے اور سنانے والا شہزادہ، کہاں کا سائنس دان تھا؟ جی نہیں، خوش قسمتی سے تاریخ نے ہمارے لیے تھوڑی سی تفصیلات کو محفوظ رکھا ہے۔ علی قلی خان نے آخری کامیابی سے

پہلے بہت سے ناکام تجربات کیے۔ غور طلب یہ ہے کہ ہر ناکام تجربے پر بھی اسے بادشاہ نے ہر بار اتنا ہی انعام دیا جتنا آخری اور عظیم الشان کامرانی پر--- پورے ایک لاکھ روپے، جو آج کے معیار سے لگ بھگ چار کروڑ ہوتے ہیں۔

جب سترھویں صدی کے برطانیہ میں سائنس سوسائٹیوں کا ایک طوفان امڈ آیا تھا، جب برلن اور برطانیہ میں صنعتی عہد کی نیو اٹھائی جا رہی تھی، جب یورپ میں آکسفورڈ اور کیمبرج کی بنیاد رکھی جا رہی تھی تو ہمارے اجداد کیا کر رہے تھے؟ ہاں وہ کنیزوں کے لیے ایسے لباس بناتے تھے جو ایک شب برتنے کے بعد بیکار ہو جائیں۔ وہ تاریخ انسانی کی سب سے خوب صورت عمارت تاج محل کی جزئیات پر عرق ریزی کر رہے تھے، مغرب چار صدیوں کے بعد بھی، جس کا جواب نہیں دے سکتا۔ ان کے جولاہے لکڑی کی کھڈیوں پر ایسی چھینٹ بناتے تھے، پیرس اور لندن کی حسینائیں جسے اشتیاق سے پہنتی اور پڑوسنوں پر رعب جماتی تھیں۔ سری نگر میں بننے والی پشمینے کی شالیں دیکھ کر یورپی رؤسا کے سانس رک جاتے تھے اور وہ ان کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے پر آمادہ رہتے۔ برعظیم کے بحری جہاز بنانے والے اتنے چابک دست تھے کہ نگاہیں دیکھتی تو بس دیکھتی ہی رہ جاتیں۔ بس یہ ہے کہ وہ سارے کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینا پسند کرتے تھے۔ اگر مشینوں سے نفرت نہیں تو وہ انھیں ناپسند ضرور کرتے تھے۔ وہ آرام اور آسودگی میں رہنا پسند کرتے تھے۔ مشینوں کا شور اور ان کی پیچیدگیاں انھیں گوارا نہ تھیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بابر کی تاریخ ساز فتح، علی قلی خان کی توپوں سے پھوٹی تھی؟ جی نہیں، علی قلی خان کی توپیں، بابر اور اس عظیم عسکری دماغ کے عزم و ارادے کی قوت سے طلوع ہوئی تھیں۔ چار سو سال بعد جب لاہور کے شاعر نے اس راز کو واشگاف کرنے کی کوشش کی کہ کامیاب اور ناکام آدمی، کامران اور ناکام معاشروں کا فرق کیا ہوتا ہے تو معلوم نہیں کنواہہ کی جنگ ان کے ذہن میں تھی یا نہیں تھی۔ لیکن میرا گمان کہتا ہے کہ حیات انسانی کے سب اسرار کے گرہ کشا آخر الانبیا، ابو قاسم، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ضرور ان کا رہنما ہو گا کہ زندگی ایک سواری کی طرح ہے۔ اگر تم اس پر سوار نہ ہو گے تو یہ تم پر سوار ہو جائے گی۔ (مفہوم) شاعر کے اپنے الفاظ یہ تھے ؎

راز ہے راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

(بال جبریل، ص ۱۴۹-۱۵۰)

بابر کے آخری باجبروت جانشین اورنگ زیب عالم گیر نے کمال فخر کے ساتھ کہا تھا کہ اس نے ۴۰ برس

تک تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر حکومت کی ہے لیکن افسوس کہ فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کا عظیم الشان کارنامہ انجام دینے والے بادشاہ کے دور میں کسی آکسفورڈ تو کجا کسی الازہر کی بنیاد بھی نہ رکھی جا سکی۔ وہ شاہ رحیم رحمتہ اللہ علیہ کو سیکڑوں دیہات پر پھیلی جاگیر عطا کرنے پر آمادہ تھے۔ حالانکہ اپنے عہد کے اس بے مثل عالم کو جاگیر نام کی کسی چیز سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ان کے ذہن میں صنعت و حرفت کی ترقی، جدید علوم کی لگن اور کسی عظیم تعلیمی ادارے کا تصور نہ ابھر سکا۔ صدیوں کی غلامی کے تجربے سے گزرنے والا برعظیم کا مسلمان آج بھی عالم گیر کا نام احترام سے لیتا ہے، وہ انھیں رحمتہ اللہ کہہ کر یاد کرتا ہے۔ اور کبھی غازی عالم گیر کہتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی کتابت اور ٹوپیاں سی کر رزق طیب کماتے تھے۔ لیکن اگر کسی کا دل نہ دکھے تو واقعہ یہ بھی ہے کہ ساری دینی حمیت کے باوجود اس باوقار بادشاہ کو دربار کے آداب پر شدید اصرار تھا۔ اس کے عہد میں امرا کی بدعنوانیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں اور آخرکار اس نے اقتدار کی باگ اس شہزادے کو سونپ دی جو بستر مرگ پر پڑے باپ کے لیے موت کی دعا مانگ رہا تھا اور بادشاہ ٹوٹتے ہوئے سانس کے ساتھ فارسی کا ایک شعر مسلسل دہرائے جاتا تھا:

به هر لحظه به هر ساعت به هر دم
دگرگوں می شود احوال عالم

یورپ نے مشین ایجاد کر لی اور جمہوریت بھی، مگر ہم گلی سڑی بادشاہت سے چمٹے رہے۔ خوئے غلامی کے مارے ہندستان میں ہم نے زندگی کی باگ جاگیرداروں، شہزادوں، والیوں راجوں اور بادشاہوں کو سونپے رکھی اور مغرب نے سلطنت کے امور کی ذمہ داری پہلے جاگیرداروں سے چھین کر بادشاہ کو عطا کی، پھر بادشاہ سے پارلیمان کو اور آخر میں پارلیمان سے عام آدمی کے حوالے کر دی۔

یہ اٹھارویں صدی کا زمانہ تھا، جب پنجاب میں شرح خواندگی ۸۰ فی صد تھی، جب برعظیم کا تقریباً ہر مسلمان شمشیرزنی اور گھڑسواری کا ہنر رکھتا تھا لیکن یہ ہنر ہمارے کام نہ آ سکا کہ علم کی دنیا کے انفس و آفاق بدل گئے تھے اور ہم زمانے کے ساتھ موڑ کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ ہمارے لیے جو کچھ کرنا ہے، بادشاہوں کو کرنا ہے۔ ہمارا کام تو ریت کے ذروں کی طرح آندھیوں میں بہنا اور تنکوں کی طرح اڑتے چلے جانا ہے۔ ہمارے مدرسوں میں چھ سو برس پہلے مرتب کیے گئے نصاب پر اصرار کیا جاتا تھا اور جیسا کہ آج بھی ہے، حتیٰ کہ جو لوگ اسے بدلنے کی بات کرتے ان پر کفر کے فتوے لگائے جاتے۔

افسوس کہ بابر کے جانشینوں میں کوئی مامون الرشید نہ تھا۔ سب محمد امین جیسے تھے جو شکار کھیلتا تو اس کے لیے مچھلیوں کے نتھنوں میں موتی پروئے جاتے تھے، جسے گویے گھیرے رکھتے تھے اور جو عورتوں سے مشورہ کرتا نظر آتا تھا۔ مغلوں کے ہاں علم کو کبھی وہ اکرام نصیب نہ ہو سکا جو تلوار کو حاصل تھا۔

ایک بار پھر پیچھے پلٹ کر دیکھیے۔ حجاز کے وہ سخت جان جو عراق' ایران اور بلوچستان کے راستے ہزاروں میل کا سفر کر کے دیبل کی بندرگاہ تک پہنچے تھے' ان کے ساتھ اونٹوں کی طویل قطاریں تھیں' جن پر سرکے میں بھگو کر خشک کی گئی روئی کے ڈھیر پڑے تھے لیکن وہ اپنے ساتھ ایمان کی خیرہ کن قوت اور تسخیر کے بے پناہ عزم کے علاوہ دو اور چیزیں بھی لے کر آئے تھے۔ وہ منجنیقیں جو قلعوں کے اندر دیواروں کے عقب میں آگ بھڑکا دیتی' اور دشمن کے حوصلے توڑ ڈالتی تھیں اور اخلاق کا وہ نظام جس کی برعظیم کی تاریک سرزمین نے کبھی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ اخلاق کا یہ نظام ایک عظیم الشان علمی ورثے پر استوار تھا کہ ایک اعتبار سے اخلاق بھی علم ہی کی ایک شاخ ہے جو تربیت سے صیقل ہو کر اور روایت بن کر طرز حیات ہو جاتی ہے۔

بے شک سندھ کی تاریک شبوں میں ان کے فولادی بازو پھڑپھڑاتی شمعوں اور شمعوں کی طرح لو دیتی تلواروں کے ساتھ فضاؤں میں بلند ہوتے تھے لیکن ان کا اصل امتیاز یہ تھا کہ وہ تاریخ انسانی کے پہلے جنگجو تھے جو جنگ کے جنون اور وحشت میں بھی' بچوں' بوڑھوں اور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے' جو مفتوحہ شہروں کو لوٹتے نہیں تھے' جو کچی دیواروں والے قدیم کارخانوں میں کاشت کاری کے آلات بناتے' کاریگروں اور کھیتوں میں مصروف کسانوں کو امان دیتے تھے۔ ندیوں اور دریاؤں کے کنارے اُگے ہوئے درخت اور فصلیں جن کے غضب سے محفوظ تھیں۔

میں حیران ہوں کہ مسلم مورخ اور خطیب ان جانبازوں کی شجاعت اور کشادہ دلی کا ذکر تو کرتے ہیں' اس نظام اخلاق پر کیوں تفصیل سے روشنی نہیں ڈالتے۔ وہ محمد بن قاسم کی عظمتوں کے گن گاتے ہیں تو وجد میں آ جاتے ہیں لیکن یہ کیوں بیان نہیں کرتے کہ اس کے لشکری بھی ایسے ہی تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ تھا' جس نے کبھی کسی بے بس خاتون پر دست درازی کی ہو۔ وہ یہ کیوں بیان نہیں کرتے کہ یہ اسی اخلاق کا کمال تھا کہ سندھ کے کناروں پر آباد ایک ہزار برس سے ہر طرح کے ستم سہہ کر بودھ مت کو سینے سے لگائے رکھنے والے سومرو چرواہے اسلام کے سامنے سرنگوں ہوئے اور اس کے باوجود سرنگوں ہوئے کہ ان کے سروں پر کوئی تلوار معلق نہ ہوئی تھی۔ ہمارے مورخ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اس عہد کا سب سے بڑا علم سپاہ گری تھا اور اس میں مسلمانوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس عہد کی معیشت' صنعت نہیں تجارت پر استوار تھی اور مسلمان ملاح وہ تھے جن سے کسی قوم کا موازنہ ممکن ہی نہ تھا۔ وہ کیوں نہیں بتاتے کہ محمد بن قاسم اسلامی تاریخ کا پہلا سالار نہ تھا' جسے ۱۷ برس کی عمر میں قیادت اور کمان سونپ دی گئی ہو۔ نصف صدی پہلے یہ معجزہ مدینتہ النبیؐ میں برپا ہو چکا تھا' جب ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ بن خطاب' تاریخ انسانی کے ان عظیم الشان حکمرانوں کو ایک کمسن لڑکے کے لشکر میں شامل ہونے کا حکم ملا اور انھوں

نے بلاچون و چرا اس حکم کی اطاعت کی۔ ہمارے مورخ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ ملوکیت کی لعنت کا شکار ہو جانے کے باوجود مسلمان معاشرے میں اب بھی علم اور تقویٰ کو بڑی فضیلت حاصل تھی۔

جزیرہ نمائے عرب، یمن، ایران، عراق، اردن، شام اور مصر کا حکمران مروان حج کے سفر پر مکہ مکرمہ آیا تو فقیہ مکہ عطاء بن ابی رباح کے قدموں میں عاجز بن کر بیٹھا رہا اور جب شہزادوں نے اس حبشی اور کم رو عالم کی بے اعتنائی پر تعجب کا اظہار کیا تو اس نے انکساری سے کہا: جان پدر! بات یہ ہے کہ تمھارے باپ کو اس کی ضرورت ہے اور اسے تمھارے باپ کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

یہی عطاء بن ابی رباح تھے جو ایک گدھے پر سوار، پانچ درہم کی قمیض پہنے مکہ سے دمشق گئے تو بادشاہ نے انھیں اپنے تخت پر بٹھایا اور ان کے مشورے پر مکہ و مدینہ کے باشندوں پر عائد کردہ ٹیکس واپس لینے، سرحدوں پر مامور سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھانے اور حجاز کے لیے پانی کی ایک نہر کھدوانے کا بخوشی حکم دینے کے بعد داد طلب نگاہوں سے بوڑھے عالم دین کی طرف دیکھا اور کہا: "کوئی اور حکم؟" تو اس کم کلام آدمی نے کہا: "ہاں، اپنے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو کہ قیامت کے دن تمھارے اعمال کے سوا کوئی چیز تمھاری مددگار نہ ہوگی"۔

وہ اپنے پیچھے خوف خدا سے روتے ہوئے حکمران کے علاوہ اشرفیوں کی ایک تھیلی چھوڑ آئے تھے۔ مروان نے اس تھیلی کو دیکھا تو ایک بار پھر رو دیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے عالم گیر تنہائی کے لمحات میں جاگیر کے لیے جاری کردہ فرمان پر شاہ عبدالرحیم کے انکار کی عبارت پڑھ کر رو دیا کرتا تھا۔

ہم اس وقت بالادست اور کارگر تھے جب تقویٰ ہمارا زاد راہ اور علم ہمارا اثاثہ تھا، جب ہمارے عطاء بن ابی رباح اور شاہ عبدالرحیم، مروانوں اور عالم گیروں پر غالب تھے۔ لیکن پھر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے صدیوں کے سفر میں آخرکار روشنی کے نگہدار تھک کے ڈھے پڑے اور آفتاب غروب ہو گیا۔ پھر قسطنطنیہ میں سلطان عبدالحمید رہ گئے جنھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عرب کے ریگزاروں میں ان کی رعایا ان پہ برہم ہو چکی، اور دہلی کے لال قلعے میں بہادر شاہ ظفر تھے، جن کے لیے موتیا کی خوشبو والا قیمہ پکانے کے لیے سیکڑوں مائیں اور درجنوں باورچی درکار ہوتے اور مزاج موزوں رکھنے کے لیے ابراہیم ذوق اور اسد اللہ غالب میں قصیدہ نگاری کا مقابلہ جاری رہتا۔

جب ہم تھک جاتے ہیں اور کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تو ہم کیا کرتے ہیں؟--- ہم پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ ہم محروم نہیں رکھے گئے۔ ہمارے لیے ۱۴ سو سال پہلے کے ایک صحرائی شہر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روشنی کا چراغ موجود ہے۔ ولقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنہ۔

سوال یہ ہے کہ یہ نمونۂ عمل کیا ہے۔ کیا محض عبادت اور پاکیزگی؟ سخاوت اور انسانی ہمدردی؟ سادگی اور شجاعت------ شاید اس سے بہت بڑھ کر، شاید اس سے بہت سوا۔

آخر کوئی سبب تو ہو گا کہ مجروح بلالؓ جیسے ہی ہوش میں آئے' ابوبکر صدیقؓ ' اس کم گو اور روشن ضمیر کو سب سے پہلے جو فکر لاحق ہوئی وہ یہ تھی کہ بلالؓ لکھنا پڑھنا سیکھ لیں۔ وہ ان کے لیے نیل کے پتے لے کر آتے اور بھگوئے رکھتے کہ سیاہی بن جائے۔ وہ ان کے لیے سرکنڈے کا قلم بناتے اور انھیں لکھنا سکھاتے۔ وہ انھیں ایک اور چیز بھی سکھاتے تھے' بار بار اصرار اور دردمندی کے ساتھ' اور وہ یہ تھی کہ بلالؓ آواز دینے اور بلانے پر بھاگ کر نہ آیا کریں۔ وہ اطاعت اور تعمیل کے لیے تعجیل سے کام نہ لیں کہ اب وہ ایک آزاد آدمی ہیں--- آزاد آدمی' آزاد آدمی--- اگر غور کیا جائے تو یہی مرد آزاد' اسلام کا منشور ہے' جو بندوں کی غلامی سے انکار کردے اور خدا کے سوا کسی کو اپنا بادشاہ تسلیم نہ کرے' جس کے قدموں میں ضمیر اور ایمان کے سوا کوئی زنجیر نہ ہو اور یہی وہ مرد آزاد ہے جو مسلم برعظیم کی ۱۳ سو سالہ تاریخ میں اسے کبھی عطا نہیں ہوا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا' محفوظ نہیں رہ سکتا' امن' امید اور امنگ سے ہمکنار نہیں ہو سکتا' اگر اس کے ادارے کمزور اور کم تر ہوں۔ اگر اس میں قانون کی قوت سب قوتوں پہ غالب نہ آ جائے۔ لیکن افسوس اس امر کا سب سے کم ادراک کیا جاتا ہے کہ علم کی بے پناہ لگن کے سوا ان مقاصد کا حصول اسی طرح ناممکن ہے' جیسے پانی کے بغیر روئیدگی کا--- کسی ملک اور معاشرے کو معاشی و اقتصادی ترقی کی آرزو ہو' دشمن اقوام کی وحشت سے نجات کی یا وحی کی روشنی میں دنیوی و اخروی زندگی کو منور کرنے کی' آخر بنی نوع انسان کے سامنے تلاش و تحقیق' غوروفکر اور حصول علم کے سوا اور کون سی راہ کھلی ہے!

آخر کوئی سبب تو ہو گا کہ نبی امیؐ مسجد نبویؐ کے چبوترے پر خود کو تحصیل علم کے لیے وقف کر دینے والے اصحاب صفہ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ کوئی گہرا اور روشن راز تو ہے کہ قرآن مجید بار بار کائنات میں تفکر پر آمادہ کرتا اور یہ قرار دیتا ہے کہ یہ عمل اللہ کی عبادت سے بھی افضل و اشرف ہے۔ آدمی پڑھتا ہے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ عالم کے قلم کی سیاہی شہیدوں کے خون سے افضل ہے۔ ان شہیدوں کے لہو سے افضل جو حساب لیے بغیر فردوس بریں کی وسعتوں میں داخل کیے جائیں گے۔

یہ ہے علم کی عظمت و فضیلت اور یہ ہے ہمارے جہل کا عالم اور اس پر بھی ہم حیرت کرتے ہیں کہ خوار و زبوں کیونکر ہیں؟ پامال اور دردمند کیوں ہیں؟ بخدا مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ ہم زندہ کیسے رہے' پامال اور تباہ کیوں نہ ہو گئے کہ ہمارے مدرسے ہزار برس پہلے کا نصاب پڑھاتے اور ہمارے اسکول مغرب سے مرعوبیت کے سوا کسی چیز کی تعلیم نہیں دیتے۔ ایک بوڑھے آدمی کے سوا' اور اسے بھی چند آیات یاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا' اللہ کے رسولؐ نے تو کسی کو تعلیم سے استثنیٰ نہ دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی

زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی مخلوق کو تعلیم دینے ہی میں گزرا۔ سکھانے، تربیت کرنے، ضبط نفس کا جذبہ اجاگر کرنے، اور اللہ سے بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے میں۔

حضرت فاطمہؓ حیا اور خودداری کی پیکر، فاطمہ الزہراؓ کنیز کے لیے التجا کرتے آئی تھیں کہ چکی چلاتے اور پانی کھینچتے ہاتھوں پر نشان پڑ گئے تھے، اور ہم جانتے ہیں کہ ہاشمیوں کی جلد کیسی نازک ہوتی تھی، لیکن اللہ کے رسولؐ نے انکار کر دیا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا، وہ اصحاب صفہ کے لیے بچا رکھا تھا۔ کون جانتا ہے کہ عمر بھر رشتوں اور تعلقات کے تقاضوں کو ہمیشہ ازبر رکھنے والے فاطمہؓ کے باپ پر کیا گزری تھی۔ لیکن ہم جانتے ہیں رات ڈھلی تو باپ نے بیٹی کے گھر کا رخ کیا اور اس پاک زاد کو وہ تسبیح تعلیم کی جو مسلمان عورتیں ۱۴سو برس سے دہراتی چلی آئی ہیں۔ محمدؐ تو تالیف قلب بھی تعلیم سے کرتے تھے۔

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ اکیسویں صدی میں تعلیم کے تقاضے کیا ہیں؟ اگر دیکھا جائے تو چودھویں صدی سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کے سوا کہ تین صدی پہلے کے صنعتی انقلاب کے بعد ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ٹکنالوجی کی اہمیت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اگر نومبر کے گلابی جاڑے میں گندم کے بیج ڈال دینے کے بعد دسمبر میں ابر نہ برسے تو ہر گزرتے دن کے ساتھ پانی کی ضرورت شدید تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر جنوری کا آسمان بادلوں سے خالی رہے اور پھر فروری کے دن بھی بیت جائیں تو اپریل میں کھلیانوں سے صرف تھوڑا سا بھوسا سمیٹا جا سکتا ہے، گیہوں نہیں--- امت مسلمہ تعلیم کے میدان میں پہلے ہی اتنی پیچھے رہ گئی کہ گویا فروری کا آغاز ہو چکا اور اب ہم مزید تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے--- یہاں تعلیم سے میری مراد جدید علوم بھی ہیں، ٹکنالوجی بھی اور اللہ کی آخری کتاب اور سیرت رسولؐ پہ غور و فکر بھی کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک سے بھی محرومی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایک محرومی فی الجملہ ہماری دنیا اجاڑ دے گی اور دوسری آخرت برباد کر دے گی۔

مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ جو قوم کسی خاص سبب کے بغیر، محض کاہلی اور لاابالی پن سے اپنی دنیا برباد کر دے تو وہ شاید اپنی آخرت کا سامان بھی نہ کر سکے۔ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان مستعد ہوتے ہیں یا غیر مستعد۔ وہ کسی ایک پہلو میں متحرک اور دوسرے میں غیر فعال نہیں ہو سکتے۔

اب سوال کا صرف آخری حصہ باقی ہے۔ فرض کیجیے اگر گزرے ہوئے وقت کا ماتم ترک کر دیا جائے اور آج سے پوری قوم حصول علم کے لیے کمر کس لے تو کیا گزرے وقت کی تلافی ممکن ہے؟ میرا جواب یہ ہے، جی ہاں ممکن ہے اور میری دلیل یہ ہے کہ پاکستان شرح خواندگی کے اعتبار سے ۱۴۲ ویں نمبر پر ہے لیکن ایٹمی صلاحیت کے اعتبار سے چھٹے نمبر پر۔ پاکستان جوہری سائنس اور میزائل سازی میں بھارت سے بہتر ہے۔ اس کے پاس ۳۰ اور ۴۰ سال کی عمر کے درمیان سائنس دانوں کی ایک ایسی کھیپ موجود ہے جن کا دنیا کے کسی بھی ملک سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ بھارتی سائنس دانوں

کو میزائل کا ٹھوس ایندھن بنانے میں پورے پانچ برس لگ گئے لیکن پاکستان کے جس سائنس دان نے سوا دو سال میں دنیا کا بہترین میزائل تخلیق کیا' اس نے یہ ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے کبھی ننگی آنکھ سے اس ہتھیار کو دیکھا تک نہیں تھا۔ پھر جب یہ میزائل داغا گیا تو اس کا نشانہ ایسا درست تھا کہ اگر مقررہ مقام پر لمبوترا حجازی تربوز دھرا ہوتا تو وہ اسے درمیان سے قطع کر سکتا یا نہ کر سکتا' ایک کونے سے ضرور جا ٹکراتا۔

سادہ سا حساب کتاب یہ ہے کہ اگر پاکستان صرف ۱۰ برس میں وہ ایٹمی ٹکنالوجی حاصل کر سکتا ہے جو عرب اور ایرانی سیکڑوں گنا وسائل کے باوجود تین عشروں میں نہیں حاصل کر سکے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ نسبتاً کہیں پس ماندہ مصر کے کھیتوں میں کپاس کی پیداوار پاکستان سے تین گنا اور خود مشرقی پنجاب میں دوگنا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نیم جاگیردارانہ سماج میں تعلیم کی اہمیت کا کبھی ادراک ہی نہ کیا گیا اور جہاں کہیں ایسا ہوا' وہاں معجزے رونما ہو کر رہے۔

حال ہی میں' مجھے اس ۳۰ سالہ سائنس دان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا' جس نے پاکستانی میزائل کا گائیڈنس سسٹم تشکیل دیا ہے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ سسٹم پی ایچ ڈی کے اس مقالے کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا جو اس نوجوان نے دو برس میں مکمل کیا تھا اور یہ کہ اب یہ مقالہ مغربی جامعات میں نصابی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ جب ایک بزرگ سائنس دان اس نوجوان کی موجودگی میں یہ ساری تفصیل بیان کر رہا تھا تو وہ خاموش رہا اور اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ لبریز پیالہ اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہتا' آواز تو خالی برتنوں سے پھوٹتی ہے۔

کیا پاکستانی معیشت چند برس میں کوریا اور ملائیشیا کے ہم پلہ ہو سکتی ہے؟ جی ہاں' بالکل ہو سکتی ہے۔ کیا پاکستان کی زراعت اس قدر فروغ پا سکتی ہے کہ پانچ برس میں سیکڑوں ارب روپے کا زرمبادلہ کمانے لگے؟ جی ہاں۔ اور یہ بات میں نہیں کہتا' سائنس دان کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی زراعت پانچ برس میں تین سو فی صد ترقی سے ہمکنار کی جا سکتی ہے۔ اس پر حیران ہونے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں' یہ مصر کے برابر ہوگی' کینیڈا اور امریکہ سے کم۔ حیران ہونے کی اس لیے بھی ضرورت نہیں کہ آسٹریلیا میں جو ہم سے کہیں زیادہ پیداوار حاصل کرتا ہے' زرخیز مٹی کی تہہ بعض مقامات پر سات انچ سے زیادہ نہیں اور پاکستان میں کہیں بھی کئی فٹ سے کم نہیں ہے۔

سائنس دان تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر انھیں وسائل فراہم کر دیے جائیں تو وہ ایک مختصر سے عرصے میں ایسے ایٹمی میزائل بنا سکتے ہیں کہ اسرائیل اور امریکہ کی بلیک میل کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے اور آئے روز دھمکیاں دینے والے اسی طرح منہ میں گھاس لے کر ہمارے پاس آئیں' جیسے ہنری کسنجر اور اس کے بعد صدر نکسن چو این لائی کے پاس گئے تھے۔ چینیوں کے ہاتھ میں ترپ کا کون سا پتا تھا؟ صرف ۲۰/ ایسے ایٹمی میزائل جو امریکی شہروں کو نشانہ بنا سکیں۔ ہم صرف ایک موٹروے کی قیمت میں ۴۰/ ایسے

میزائل بنا سکتے ہیں۔

تو پھر ہم بناتے کیوں نہیں؟ کیا اس لیے کہ ہمارے پاس وسائل موجود نہیں؟--- گذشتہ روز سی بی آر کے ایک ایسے عہدے دار سے میری مفصل ملاقات ہوئی' جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ دریا میں رہ کر بھی اپنے لب خشک رکھتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر سی بی آر کی سربراہی ایک سخت گیر اور ایمان دار افسر کو سونپ دی جائے جو کسی بھی طرح کی سفارش ماننے سے انکار کر دے اور جو اپنے ماتحتوں کا جذبہ عمل بیدار کر کے ان سے کام لے سکتا ہو تو زیادہ سے زیادہ دو سال کے اندر قومی آمدن میں ۲۰۰/ ارب روپے سالانہ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر ۲۰۰۰/ارب روپے کی متوازی کالی معیشت کو ٹیکس کے جال میں شامل کیا جا سکے تو یہ اضافہ ۴۰۰/ ارب روپے تک ممکن ہے۔ ایک دوسرا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ٹیکس کے موجودہ قوانین ختم کر کے زکوٰۃ اور عشر کے اسلامی قوانین نافذ کر دیے جائیں تو یہ آمدن کم از کم ۱۲۰۰/ ارب سالانہ ہو گی۔

تو پھر ایسا ہوتا کیوں نہیں؟ جی ہاں' نہیں ہو سکتا کیونکہ حکمران یا تو اپنے مفادات کی حفاظت کر سکتے ہیں یا پھر اپنے وطن اور رعایا کی۔ اور جو لوگ بیساکھیوں پر کھڑے ہوں' بیرونی بنکوں میں جن کے اربوں ڈالر پڑے ہوں اور استعماری ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے پاس ان کھاتوں کی تفصیلات موجود ہوں وہ زنجیریں کاٹ نہیں سکتے' ان میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ وہ بوجھ ختم نہیں کر سکتے' بڑھا سکتے ہیں۔

اور بیرون ملک پاکستانی؟--- وہ ۸/ ارب ڈالر سالانہ بچاتے ہیں۔ وہ ابھی پچھلے برس تک اپنی بچتوں کا ایک حصہ پاکستان میں جمع کرایا کرتے تھے لیکن بیرونی کرنسی کے کھاتے منجمد ہونے کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔-- سوال یہ ہے کہ اگر اس ملک میں امن و امان کی مثالی فضا قائم ہو جائے اور اس ۸/ارب ڈالر میں سے نصف رقم بھی پاکستان آنے لگے؟--- ۴/ارب ڈالر سالانہ۔ اور اطلاعاً عرض ہے کہ اگر افغانستان میں امن قائم ہو جائے اور وسطی ایشیا کے ممالک کراچی کے راستے سمندری تجارت کا آغاز کر دیں تو ایک اندازے کے مطابق پاکستان کو راہداری کے عوض کم از کم دو ارب ڈالر سالانہ حاصل ہوں گے۔

لیکن یہ سب کون کرے؟ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟ کم از کم مغلوں کے جانشین تو نہیں باندھ سکتے کہ مغل دربار میں تعلیم نہیں صرف تلوار معتبر تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے معاشرے میں جاگیرداروں کے بل پر بروئے کار آنے والے مغل اقتدار کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ صرف یہ ہوا ہے کہ بیچ میں دو سو برس انگریزوں کو مل گئے اور ہر استعمار کی طرح وہ ہمارے ہاں ایک تیسری جنس چھوڑ گئے' جس کا بس چلے تو سجدہ بھی نیویارک میں مجسمہ آزادی کے رخ پہ کیا کریں۔

میں اعلیٰ تعلیم کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا محمد شریف منجم توپ سازی کا علم رکھتا تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کنواہہ کی جنگ جیتنے کے بعد بابر نے منجم کو معاف کر دیا تھا بلکہ گذشتہ خدمات کے صلے میں

ایک لاکھ روپے بطور انعام عطا کیے۔ پھر بابر نے اسے ہندستان سے نکل جانے کا حکم دیا کہ گذشتہ حملوں کے برعکس اب وہ لوٹ جانے کا نہیں، برعظیم میں قیام کرنے اور ایک مستقل حکومت بنانے کا عزم رکھتا تھا۔ اب وہ محمد شریف اور اخلاص خان ایسے شاکی اور کمزور رفیقوں کا روادار نہ تھا۔ ہند کے کفرزار میں اسلام کی فتح پر اس نے ایک رباعی لکھی اور مولانا زین العابدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ادب سے ان کے گھٹنوں کو چھوا اور نومسلموں کے سے جوش و خروش سے کہا: "اسلام کی فتح کے لیے میں جنگلوں میں آوارہ پھرتا رہا"۔ مولانا مسکرائے اور قرآن کی ایک آیت پڑھی کہ خودپرست بادشاہ زعم اور نفس پروری کا شکار نہ ہو۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ منجم کے برعکس بابر نے مولانا زین العابدین کی خدمت میں کوئی نذر پیش نہ کی۔ آدمی حیرت اور رنج سے سوچتا ہے کہ اگر بابر منجم کے ایک لاکھ اور ہمایوں کے ایک کروڑ میں سے کچھ حصہ مولانا کو فروغ علم کے لیے پیش کرتا تو کیا مسلم برعظیم کی تاریخ مختلف نہ ہوتی؟ اس وقت جب ایک ہندستانی روپیہ ۴۸ برطانوی پاؤنڈز کے برابر تھا اور برعظیم میں زراعت، پارچہ بافی اور جہاز سازی سے حاصل ہونے والی کل آمدن سارے کرۂ ارض کی کل پیداوار کا ۲۵ فی صد تھی۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مغلوں کے دربار میں تعلیم نہیں تلوار معتبر تھی۔ جب تک تلوار پہ تعلیم کو اور جاگیرداروں پہ جمہوریت کو غلبہ حاصل نہ ہو گا، ہم اکیسویں صدی تو کیا اٹھارویں صدی کے تقاضے بھی پورے نہ کر سکیں گے۔ ہمارے امرا کے بچے حصول تعلیم کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج کا رخ کرتے رہیں گے اور ہمارے غریب حسرتوں میں جینے یا خودسوزی کا بھیانک خواب دیکھا کریں گے--- اور اگر ان میں سے کوئی فارسی کی شد بد حاصل کر لے گا تو شاید گاہے بہ گاہے وہ شعر پڑھا کرے گا جو ۱۷۰۷ء میں وفات پانے والا اورنگ زیب عالم گیر بستر مرگ پر دہراتا رہا:

بہ ہر لحظہ بہ ہر ساعت بہ ہر دم
دگرگوں می شود احوال عالم

اگر ہمیں اکیسویں صدی میں ایک آزاد اور خودمختار قوم کے طور پر داخل ہونا ہے تو دست وحشت کو بروئے کار لانا ہو گا اور اپنی زنجیر توڑ پھینکنا ہو گی کہ جو پابہ رسن ہوں وہ ابھر نہیں سکتے۔ وہ صرف روشنی کی آرزو کر سکتے ہیں، اسے پا نہیں سکتے۔

ماہرین تعلیم سے میری گزارش یہ بھی ہے کہ جب وہ نئی صدی کے تعلیمی تقاضوں پر غوروفکر کریں تو براہ کرم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش بھی کریں کہ ملوکانہ ذہنیت کو علم کے فروغ سے وحشت کیوں ہے اور یہ کہ غلاموں کے گروہ حصول علم کی آرزو بھی رکھتے ہیں یا محض زندہ رہنے کی؟ (یہ مضمون اسلامی جمعیت طلبہ کے زیراہتمام منعقدہ سیمی نار، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد میں پڑھا گیا)۔